جدید ہندوستان میں اسلامی فکر

(تجزیہ اور تنقید)

از جناب جلال الحق صاحب ایم اے

جدید ہندوستان میں اسلام کو بحیثیت مذہب قبول کرنے والے جو رجحانات موجود ہیں، انھیں ان کی تفصیل، ترکیب اور مزاج و میلان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان سب میں اسلام کو بطور ایک مکمل نظامِ حیات کے سمجھنے کی بات نمایاں نظر آئے گی۔ اس تصور کا خصوصی حامل راسخ العقیدہ حرکیتی کا وہ مخصوص گروہ ہے جو مولانا مودودی کو اسلام کی دعوتی و انقلابی اسپرٹ کو

راسخ العقیدہ حرکیت

دوبارہ زندہ کرنے والی شخصیت تصور کرتے ہوئے اپنا ایک مخصوص نظام اصطلاح (Terminology) ترتیب دیتا ہے۔ اس کے مطابق اسلام اپنی اس صورت میں جو کہ انبیاء و رُسل علیہم السلام کی تعلیمات سے براہ راست ماخوذ ہے، ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو اپنا کامل اظہار ایک ایسی تنظیمی ہیئت میں کرتا ہے جس کی مجموعی کارکردگیاں ایک واضح نصب العین کے ماتحت ہوں نیز جس کی اکائیاں اپنی زندگیوں کو اس نصب العین سے ہم آہنگ کر چکی ہوں یا کرنے میں مصروف ہوں، اور وہ اس منظم حرکیت کو تحریک اسلامی کا نام دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے اپنے الفاظ میں تحریک اسلامی کا مقصد اور نصب العین اقامت دین یعنی ایک ایسے جامع اور ہمہ گیر نظام زندگی کا قیام ہے جو اپنے تصورِ حیات، اپنے اصول، اپنے مقاصد اور اپنے تفصیلی قوانین ہر چیز میں تمام تر اللہ رب العالمین کے احکام و ہدایات پر مشتمل

ہوئے" یا اس گروہ کے قائد اوّل کے الفاظ میں:

"تمام مسلمانوں کو یہ جان لینا چاہیئے کہ بحیثیت ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق اس تحریک سے جس کے لیڈر انبیاء علیہم السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظامِ فکر اور ایک خاص طریق کار ہوتا ہے۔ اسلام کا طریقِ کار اور طریقِ فکر وہ ہے جو ہم کو انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہم خواہ کسی ملک اور کسی زمانے میں ہوں اور ہمارے گرد و پیش زندگی کے معاملات و مسائل خواہ کیسی ہی نوعیت کے ہوں، ہمارے لئے نصب العین وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام کا تھا اور اس نصب العین تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاءؑ ہر زمانہ میں چلتے رہے .....

..... یہ بات ہمارے مرتبہ سے فروتر ہے کہ ہم اس تنگ زاویہ نگاہ سے معاملاتِ دنیا پر نگاہ ڈالیں جس سے ایک قوم پرست یا وطن پرست یا ایک جمہوریت پسند یا اشتراکی ان کو دیکھتا ہے[2]"

مختصراً اس گروہ کے نزدیک وہی تحریک تحریک اسلامی کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے جو اقامتِ دین یا حکومتِ الٰہیہ وغیرہ کا نصب العین اختیار کرکے، ان دیگر نظام ہائے زندگی کے خلاف جو کہ اسلامی نظامِ زندگی سے جزواً یا کلاً متقابل ہوں، منظم، مربوط و رسمی جدوجہد کرے اور اسلام کے چند مخصوص اجزاء کی دعوت انسانوں کے کسی مخصوص گروہ کو دینے کی بجائے اسلام مجموعی (ان کی اپنی تعبیر کے مطابق) کا تصور رکھتے ہوئے بین الانسانی معاشرے کو اپنا مخاطب بنائے۔ اس طرح یہ مخصوص تصور اسلامی حرکیت

اسلامی حرکیت کا دوسرا مفہوم

کے اس دوسرے مفہوم سے بظاہر متصادم محسوس ہوتا ہے جو اس کو کسی مخصوص فرد، ادارہ یا جماعت کا فعل سمجھنے کی بجائے ان تمام افراد،

---

[1] تحریک اسلامی ہند از مولانا صدر الدین اصلاحی ص ۴۰

[2] ترجمان القرآن جلد ۱۶ ص ۳۰۴

اداروں اور انجمنوں کی علیٰحدہ علیٰحدہ مساعی کے مجموعی دباؤ کی پیش رفت سمجھتی ہے، جو کسی نہ کسی طرح اسلام کو فائدہ پہنچاتی ہوں۔ خواہ وہ اسلام کے کسی ایک یا چند پہلو ہی کی تبلیغ میں کوشاں کیوں نہ ہوں اور خواہ ان کی دوسری سرگرمیوں کی تشکیل ان اصولوں پر نہ ہو جو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس تصور کے مطابق یہ بھی ضروری نہیں کہ ان تنظیموں، انجمنوں یا جماعتوں سے وابستہ افراد کا فہم ان کے نصب العین کے شعوری طور پر مطابق و اس سے ہم آہنگ ہو۔ نیز یہ کہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ ان کی مساعی دراصل ان کے مذہب کی بقاء و قیام کی خاطر یا بالفاظ دیگر رضائے الٰہی کے لئے ہو اپنی تفصیل میں یہ تصور بتاتا ہے کہ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ امت نے ابتداہی سے اپنے فکری و تاریخی تسلسل میں تفردات کو ٹھکرا کر صرف انھیں عناصر کو آگے بڑھایا ہے جو اسلامی مزاج کے مناسب حال تھے۔ اس کے مطابق سرسید کی تعلیمی تحریک، تحریکِ دیوبند، ندوۃ العلماء، جمعیۃ العلماء، تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی حتیٰ کہ مسلم لیگ اور مسلم مجلس بھی اسلامی حرکیت کو آگے بڑھانے والی مختلف اکائیاں ہیں۔ ان اکائیوں میں علیٰحدہ علیٰحدہ ان کے روشن پہلوؤں کے ساتھ تاریک پہلو بھی ہو سکتے ہیں لیکن زمانی تواتر و توالی میں اسلامی اساسیت کا مضبوط دباؤ ان غیر صالح اجزاء کو تحلیل کر دیتا ہے اور آنے والی نسلوں کو صرف وہی اجزاء منتقل کرتا ہے جو اسلامی تعلیمات کے مطابق اور اس کے مناسب حال ہوتے ہیں۔ اس کی مثال ایک دریا جیسی ہے جو راستے میں مختلف غلاظتوں سے دوچار ہوتا ہے لیکن اپنے طبعی سیلان کے ذریعہ ان غلاظتوں کو الگ ہٹاتا، پیچھے چھوڑتا صرف پاک و صاف پانی کے ساتھ آگے بڑھ جاتا ہے۔

مذہب کی ان دونوں تعبیروں سے الگ ایک تیسرا تصور بھی ہے جو اگرچہ ابھی بہت واضح اور مربوط شکل میں عوام کے سامنے نہیں آیا ہے اور مختلف اسباب کے تحت ان میں نفوذ و قبولیت سے محروم ہے پھر بھی اسے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد اور اپج رکھنے والے اذہان کی تائید حاصل ہے۔ یہ تصور ایک ایسے طبقہ کی طرف سے سامنے آیا ہے جو اپنی مسلمہ علمی و ادبی حیثیت، وسیع المشربی اور بہتر مطالعہ کے باعث ہندوستانی سماج میں وہ مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا ہے جس کا کہ وہ

مستحق تھا۔ یہ گروہ ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے جمہوری و دستوری فضا کا جزو لاینفک سمجھتے ہوئے ان کے مذہب کی جو تعبیر کرتا ہے اس کے مطابق اسے ہم اسلام کی سیکولر تعبیر کا نام دے سکتے ہیں۔ اسی مکتبِ فکر کی نمائندگی کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عابد حسین اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں" کے آخری حصے میں لکھتے ہیں:

مذہب کا سیکولر اپروچ

"یہ بظاہر ایک چھوٹی سی بات تھی لیکن اس نے مسلمانوں کے پورے تصورِ زندگی اور پورے اندازِ فکر کو بدل دیا۔ اس کی نظر میں ملتیں مٹ کر اجزائے ایماں ہوگئیں۔ اور دیواریں جو تہذیبوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھتی تھیں گر گئیں۔ اسے محسوس ہوا اور خلوص و شدت سے محسوس ہوا کہ انسانی تہذیب ایک اور ناقابلِ تقسیم ہے۔ اسے اپنی تہذیبِ نفس اور تکمیلِ ذات کے لئے ہر چیز جس میں اسے اپنے ایمان کی روشنی میں کسی اخلاقی قدرِ اعلیٰ کی جھلک نظر آئے خواہ وہ مشرق سے ملے یا مغرب سے، جنوب سے ملے یا شمال سے لینی ہے اور اپنانی ہے۔ طلبِ صادق نے اس کے اندر جذبۂ صادق بھی پیدا کر دیا اور عالمی تہذیب کی ہر صالح قدر خود بخود کھنچ کر اس کے پاس آنے لگی۔ علم اور علمی اندازِ نظر اس کی طرف اس طرح دوڑا جیسے کھوئی ہوئی بھیڑ اپنے چرواہے کی طرف دوڑتی ہے۔ آزادی اور مساوات کا جمہوری مزاج اس سے چمٹ کر اس طرح گلے ملا جیسے بچھڑا ہوا رفیق ملتا ہے۔ معاشی انصاف کی سچی روح نے بڑے تپاک سے اسے سلام کیا جیسے مدتوں سے اسی کی تلاش تھی....." ص ۳۶۲

"اب وہ اپنی زندگی کے دو بڑے مقاصد سمجھتا ہے ایک عبادت اور دوسرے تبلیغ۔ مگر اب اس کے ذہن میں عبادت اور تبلیغ کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے جو بیسویں صدی کے وسط میں تھا۔ جب وہ ایک تاریک و یاس انگیز دور سے گذر رہا تھا۔ اس وقت اس کی عبادت خاک کی آغوش میں پیوستہ مناجات تک محدود تھی۔ اب وہ اس مناجات سے شروع ہوتی ہے اور سینۂ آفاق میں تکبیرِ مسلسل پر ختم ہوتی ہے۔ مگر تکبیر اب اس کا سیاسی نعرہ نہیں رہی بلکہ اس کی نفسِ حیات کی آمد و شد بن گئی۔ اب

وہ اسے اپنے مخالفوں کے دل میں خوف پیدا کرنے یا اپنے خوف کو چھپانے کے لئے نہیں استعمال کرتا بلکہ اللہ کی قوت وقدرت یاد دلاکر اپنی اور دوسروں کی ہمت بڑھانے اور انھیں اس پر ابھارنے کے لئے کہ اس دنیا کو اپنے سعی وعمل سے ایسا بنا دیں کہ وہ خالق کائنات کی عظمت کی گواہی دے ۔ اب اس کی عبادت کا مفہوم بھی وسیع ہوگیا ہے اور وہ ہر عمل کو جو اخلاقی اقدارِ عالیہ، علم وعرفان، خیر وبرکت، عدل وانصاف اور حسن ومحبت کے ہوکتا ہے، عبادت سمجھتا ہے۔ ....“ ص ۳۶۳

ت کے تصور کی طرح اس کے تبلیغ کا تصور بھی بدل گیا ہے ۔ وہ اسلامی اقدار کو دنیوی علم وعقل اور اخلاق کی زبان میں جو کہ دنیا کی مشترک زبان ہے عام انسانی اقدار کی حیثیت سے پیش کرتا ہے ۔ بعض لوگ ان اقدار کے ساتھ خود بخود اسلامی عقیدے کو بھی قبول کر لیتے ہیں، بعض جو انھیں پہلے سے اپنے آبائی عقیدے کے لوازم کے طور پر مانتے آئے ہیں انھیں اور زیادہ خلوص اور جوش سے ماننے لگتے ہیں ۔ ہندوستانی مسلمان ان آخر الذکر کو بھی خواہ وہ کسی مذہب کے بھی ہوں مسلمین بالعمل سمجھتا ہے، انھیں مصافِ زندگی میں اپنا رفیق بناتا ہے اور ان کے ساتھ مل کر اپنے دیش میں اور پھر ساری دنیا سچائی اور محبت اور انصاف ـــ قانونی، سماجی، معاشی انصاف کا جھنڈا بلند کرتا ہے۔“

ص ۳۶۴

عمرانی وتاریخی عوامل کی تاثرانگیزی

اسلام کا یہ تصور پیش کرنے والے انسان کی تہذیبی تشکیل میں کام کرنے والے ان عمرانی و تاریخی عوامل کی تاثّر پذیری کے بارے میں بے جا طور پر حساس ہیں جو کہ انسان اپنے قدیم وطنی ماضی سے وراثتہً حاصل کرتا ہے اور جو اس کے خیال کے مطابق اس کے ایمان کی نفی نہیں کرتے ۔ اس تصور کے مطابق انسان کو اپنے ”لچکدار“ اساسی عقائد کو اس جدید سیاسی ومعاشی ماحول سے جس میں کہ اس کے نفس کی آمد وشد ہورہی ہے اور جس سے وہ بیگانہ نہیں رہ سکتا، اس طرح مطابقت دینا چاہئے کہ اس کا عقائدی

تشخص مجروح نہ ہونے پائے۔ ان کے مطابق موجودہ ہندوستان کا جمہوری مزاج، معاشرتی و معاشی عدل کے لئے دستوری اور رسمی سعی، علم و عرفان کا سیکولر اپروچ، مسلمان کے مومنانہ مزاج سے متغائر نہیں ہے۔ یہ قدریں اس کی اپنی ہیں اور اس کی تبلیغ و توسیع میں اس کی جدوجہد اس کی ایمانی انفرادیت کو تحلیل کر دینے کے مترادف نہیں ہوگی بلکہ اس کے برعکس وہ اس سے حقیقی معنوں میں دین و دنیا کی دوئی میں وحدت پیدا کر سکنے میں کامیاب ہو سکے گا۔[۵] اس تصور کے حامئین مسلمانوں کے گرد پھیلے ہوئے پیچیدہ ماحول کو زیر بحث لاتے ہیں اور معاشرتی تعلقات کو منضبط کرنے والے رسمی اور غیر رسمی اداروں کی بدلی ہوئی نوعیت اور پھیلتے ہوئے دائرہ اثر کو اہمیت دیتے ہیں۔ ماحول کی اس ہمہ گیر اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اس سے جو اصول اخذ کرتے ہیں وہ عموماً ان قدروں سے تصادم پر منتج ہوتے ہیں جو کہ اسلامی اساسیات کے منطقی تقاضے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے استدلال کے لئے اساسی سرچشموں سے بے توجہی بھی اسے انحرافیت پسندی Apostasism کی طرف لے جاتی ہے۔ بہرحال یہ ایک منفی رجحان ہے جس پر بحث اپنا ایک الگ موضوع رکھتی ہے۔

جدید ہندوستان میں اسلامی فکر کی صحت مند نمائندگی کرنے والے جو گروہ موجود ہیں اور ان میں علٰحدہ علٰحدہ جو ارتباط و تنظیم ہے، آج سے تیس پینتیس سال پہلے اس کا فقدان تھا۔ یہ اپنی سرگرمیوں کے رخ اور اصطلاحات کے لئے اسباب و عوامل کے طور پر ہندوستان کی ماضی قریب کی تاریخ سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ اس لئے انھیں صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اس ماضی کا جائزہ لینا لابدی اور ناگزیر ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ بات اہم ہوگی کہ یہ جائزہ تعصبات اور قبل معتقدات Pre-supposition کی محدودیتوں سے اٹھ کر لیا جائے اور معروضی انداز فکر اپنایا جائے۔ اس بات کی اہمیت خصوصاً اس لئے اور

تاریخ کا معروضی تجزیہ

---

[۵] ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں ص ۲۴۴

ہے کہ برصغیر ہند کی یہ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ اپنی بزم میں اتنی رنگارنگی اور تنوع لئے ہوئے ہے کہ مشاہدہ کا اپنے مزعومات اور مفروضات سے اٹھنا دشوار ہوتا ہے۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہم تاریخی کیفیتوں کا مطالعہ کرتے وقت تاریخ کو اس کی حقیقی تعریف کی روشنی میں سمجھیں گے اور اسے مجموعہ وقوعات کا نام دینے کی غلطی نہ کریں گے۔ بلاشبہ تاریخ ایک آئینہ ہے جس میں ایک قوم کا اجتماعی سراپا دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی اصل قامت اس کا رنگ روپ، اس کے خدوخال، اس کے جذبات واحساسات، ہر چیز کی جھلکیاں اس میں نظر آتی ہیں۔ تاریخ محض بادشاہوں کی داستان اور سیاسی بساط کے رنگ و آہنگ کا نام نہیں ہے، یہ تو پورے تہذیبی سرمایہ کی عکاس ہے۔ ماضی کے مختلف درجہ بند وقوعات ایک دوسرے کو جس طرح متاثر کرتے ہیں اور تاثر قبول کرتے ہیں اور اس باہمی تعامل سے ان میں جو رشتے استوار ہوتے ہیں، انھیں کا اکتسابی فہم علم تاریخ کہلاتا ہے۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد

برصغیر ہند میں اسلام کے نام کے ساتھ جو لوگ آئے اور جنھیں یہاں استحکام حاصل ہوا، ان کی زندگیاں محبت و تبلیغ کے ان روحانی جذبات سے معمور نہیں تھیں جن کا کہ ان کا مذہب ان سے مطالبہ کرتا تھا۔ اسلام اپنی طبیعت کے اعتبار سے ایک مذہب ہے جو متصوفانہ طریقوں سے شخصیت کو اخلاقی استحکام بخش کر اجتماعی دائروں میں زندگیوں کی تشکیل کرتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دور رسالت اور اس کے بعد قریبی زمانہ کی مسلم زندگیاں رزم و بزم کی متخالف سمتوں میں جانے والی ابعاد سے یکساں طور پر عہدہ برآ ہونے کی جستجو کرتی نظر آتی ہیں۔ گل و سیف کی دوئی میں وحدت پیدا کرنے کی سعی میں ان کی کامیابی نے ایک قلیل عرصہ میں متمدن دنیا کے ایک بڑے حصے کو ان کی اجتماعی وجودیت سے آشنا کرا دیا تھا۔ دیگر عرانی خطوں کے برعکس جہاں کہ فاتح افواج اپنے ساتھ پرخلوص مبلغین کا ایک گروہ بھی لاتی تھیں، ہندوستان میں "ہم نہیں سنتے کہ کسی (فوج) کے ساتھ مبلغین یا داعیین کا گروہ تھا۔ لیکن وہ اپنے مذہب سے بالکل بے تعلق بھی نہیں تھے۔ یہ صورتحال غزنی کے محمود کے ساتھ بھی تھی اور تیمور کے ساتھ بھی۔" یہی اسباب تھے جن کے باعث اسلام ہندوستان میں اس ہمہ گیر فطری تاثر پذیری میں ناکام رہا جس کا مظاہرہ اس نے دیگر

جگہوں پر کیا تھا۔ یہاں پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مسلم افواج کو ابتداً جن اقوام پر عسکری و تہذیبی غلبہ حاصل ہوا تھا ان میں سے بیشتر ثقافتی اعتبار سے عروج پر تھیں جبکہ ہندوستان سیاسی مغلوبیت کے اس دور میں مذہبی و سیاسی ناوجدتی سے دوچار تھا۔ بہرحال مسلم قوم ہندوستان میں چھ صدیوں تک بلا شرکت غیرے حکمراں رہی اور پھر مختلف عوامل کے تحت جو ارتقائے معکوس شروع ہوا تو اس صورت حال پر منتج ہوا کہ جو قوم پہلے وطن دوست مجاہدین پیدا کرتی تھی اب اس کی آغوش میں 'بانکے' پرورش پانے لگے۔[1] نتیجتہً پندرہویں اور سولہویں صدی میں جن غیر ملکی عناصر نے اپنا دخول شروع کیا تھا وہ تجارتی دائروں سے ہٹ کر سیاست و سلطنت کے دائروں میں اپنا دباؤ محسوس کرانے لگے اور اس سے جس آویزش و تناع کا آغاز ہوا وہ مختلف مرحلے طے کرتا ہوا بالآخر انیسویں صدی کی چھٹی دہائی کی ہولناک خونریزیوں پر ختم ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جہاں سے ہماری جدید وطنی تاریخ کی ابتداء ہوتی ہے۔

۱۸۵۷ء کی ناکام مسلح جدوجہد جہاں مسلمانوں کے مکمل سیاسی سقوط پر ختم ہوئی وہیں ان کے لئے ابتلاء و آزمائش کے ایک نئے دور کا آغاز بھی ہوا۔ انیسویں صدی کے نصف بعد کی مسلم سماجیات اس قوم کے لئے معاشی دقتوں، سیاسی استبداد، مذہبی تعصبوں کی اثر پذیری اور معاشرتی ناہمواریوں پر مشتمل ہے۔ غلط یا صحیح طور پر انگریزوں نے بغاوت کا ذمہ دار مسلمانوں ہی کو قرار دیا۔ چنانچہ کورنڈیکر کے الفاظ میں: "کچھ برطانوی افسروں نے یہ کہا کہ اس بغاوت کی ابتدا اور تحریک مسلمانوں کی طرف سے ہوئی ہے۔ بنگال سول سروس کا ایک عامل ہنری تھامسن ۱۸۵۸ء میں بغاوت کے بارے میں لکھتا ہے کہ "یہ مسلم سازش کا نتیجہ تھی۔ ان کے وسائل سے قطع نظر بھی ہندو کبھی اس طرح کے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے نہ ڈال سکتے تھے۔ وے (مسلمان) ابتدائی خلفاء سے لیکر آج تک یکساں طور پر مغرور، غیر روادار، بے رحم اور کسی بھی ذریعہ سے اپنی برتری کے خواہاں غیر عیسائیوں سے گہری نفرت رکھنے والے رہے ہیں۔ وہ کبھی ایسی حکومت کی اچھی رعایا نہیں بن سکتے جس کا مذہب

---

[1] برصغیر ہندو پاک کی ملتِ اسلامیہ مصنفہ اشتیاق حسین قریشی ص ۲۲۲

دوسرا ہو اور قرآنی احکامات ان کو اس پر آمادہ کرتے ہیں۔"[1] انگریز اپنے سیاسی غلبہ کے ساتھ ایک جدید تہذیب بھی لائے تھے اور ہندوستان میں "اسلام کو اب اس نئی مغربی تہذیب کا سامنا تھا جو اپنے ساتھ سیاسی حاکمیت بھی رکھتی تھی۔ نئی نئی حاصل ہوئی طاقت کے نشے میں مخمور یہ غیر ملکی اپنی تہذیبی برتری کے تعلق سے ضرورت سے زیادہ پُراعتماد اور اپنے کو ایسے علاقوں کے لئے نئی روشنی کا پیغامبر سمجھتے تھے جہاں خود ان کے مطابق جہل کی مکمل تاریکی نیز ذہنی اور اخلاقی پستی چھائی ہوئی تھی۔"

سیاسی بحالی کی طرف سے مایوسی اور اس جدید طاقتور تہذیب سے خوفزدگی کا ملا جلا علٰحدہ علٰحدہ ردِ عمل ہم اس زمانہ کے فوراً بعد کی مختلف شخصیتوں، اداروں اور تنظیموں میں دیکھتے ہیں۔ بالکل ابتدائی ردِ عمل کے مظاہر دو متوازی تعلیمی تحریکیں ہیں جن میں سے ایک سرسید کی علی گڑھ تحریک اور دوسری تحریک دیوبند تھی جس کے پیشوا مولانا قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی وغیرہ تھے۔ یہ دونوں تحریکیں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اخلاص و رجائیت کی قدروں پر باہم مشترک ہونے کے باوجود ترکیب و طبیعت کے اعتبار سے حد درجہ مختلف و متغائر تھیں ان میں سے اول الذکر نے جہاں مسلمانوں کی تعلیمی بہتری، معاشی بحالی اور سیاسی آسودگی کے لئے جدوجہد کی وہیں عقائد و تاریخ کے تعلق سے کچھ ایسی معذرت خواہانہ Apologetic روش بھی اختیار کی جو راسخ العقیدہ مسلم علماء و عوام کے لئے ناقابلِ قبول تھی۔ اس کے ٹھیک برعکس ثانی الذکر طبقہ اپنی اساسیت پسندی کے باوجود اس فراست و بصیرت سے محروم تھا جو کہ ان کے مذہب کا ارتقائی و حرکت پذیر تصور پیدا کرتا ہے، جس کے مطابق وہ اپنے مذہب کو اس کی حقیقی صورت میں باقی رکھتے ہوئے منقلب حالات و ماحول کے مطابق بنا سکتے تھے۔ وہ اپنے مستقبل کی تعمیر بوسیدہ ماضی کی تابناک روایتوں پر کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کو جیسے اس کے صالح و غیر صالح عنصر کے ساتھ اپنانے کا

---

[1] Islam in India's Transition to Modernity
P. 136 by Karandikar

مشورہ سرسید دے چکے تھے، بالکلیہ رد کر دیا۔ پھر بھی اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ نہ تو سرسید مذہب مخالف تھے اور نہ ہی علما ترقی مخالف، جس کا ثبوت سرسید کے اس خاص تاثر سے ملتا ہے جو انھوں نے علی گڑھ سے فارغ طلبہ کی مذہب بیزاری پر ظاہر کئے تھے نیز دوسری طرف شاہ عبدالعزیز بہت پہلے انگریزی پڑھنے کا فتویٰ دے چکے تھے اور خود مولانا قاسم نانوتوی نے اپنی آخری عمر میں انگریزی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

سرسید احمد خاں

اس زمانے میں سرسید کی شخصیت خصوصاً انتہائی فیصلہ کن رہی ہے۔ بشیر احمد ڈار کے لفظوں میں کہ "۱۸۵۷ء کے بعد کی مسلم جدوجہد جو وہ اپنی زندگی کے تمام مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی دائروں میں کر رہے تھے، اس ایک شخص کے گرد گھومتی ہے[1]۔" سرسید کے تعلیمی، مذہبی اور سیاسی خیالات نے برصغیر میں بعد کے رجحانات اور تحریکوں کو متعین کرنے میں گہرا حصہ لیا ہے۔ ان کے افکار کو مفصلاً سمجھنے کے لئے ہم سطور ذیل میں کچھ اقتباسات نقل کرتے ہیں جو ڈاکٹر سید عابد حسین کی کتاب 'ہندوستانی مسلمان' اور ان کے تفصیلی مضمون 'عالم اسلام میں تجدد کی تحریکیں' شائع شدہ 'اسلام اور عصر جدید' سے ماخوذ ہیں:

"سرسید کو ہندوستان اور ہندوستانی قوم سے بڑی محبت تھی۔ اور وہ اپنے امکان بھر ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کو خاص طور سے اپنے ہم مذہبوں یعنی مسلمانوں کی فکر تھی، اس لئے کہ وہ بہت زیادہ خطرہ میں تھے، انھیں انگریزی حاکموں سے نفرت تھی اور انگریز انھیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا اصل ذمہ دار سمجھ کر ان کے دشمن ہو گئے تھے اور انھیں دبا کر رکھنا چاہتے تھے۔ سرسید نے مسلمانوں کی جماعت کو قعرِ مذلت سے اور مایوسی سے نکال کر ذہنی اور مادی ترقی کی راہ پر لگانے کے لئے ایک ہمہ گیر منصوبہ تیار کیا....."

---

(1) D.269 Religous thought of Sir Syed. by B.A. Dar

سرسید کی تحریک تجدد کو سمجھنے کے لئے دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ انھیں براہ راست مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی اصلاح سے اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی ان کی ذہنی اور مادی ترقی سے۔ دوسرے یہ کہ ان کا جدید سائنس اور جدید تہذیب کا تصور کچھ رومانی قسم کا تھا۔۔۔[۱]"

"مگر جب بمبئی میں ہندو مسلم فسادات ہوئے اور مہاراشٹر میں لوک مانیہ تلک کی سرپرستی میں گنپتی کا میلہ جاری ہوا اور گاؤکشی بند کرنے کی تحریک شروع ہوئی تو شمالی ہند کے مسلمانوں میں بےچینی اور شبہ کی لہر دوڑ گئی جس کا اثر سرسید پر بہت گہرا پڑا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر مسٹر بیک نے ان کو اس پر راضی کر لیا کہ محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن بنائی جائے جس کے مقاصد میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا، ان کو سیاسی شورش سے دور رکھنا اور سلطنت برطانیہ کے استحکام اور حفاظت میں مدد دینا سب سے اہم تھے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ یہ انجمن مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھنے میں کامیاب نہیں رہی مگر پھر بھی مسلمانوں کے ایک حلقہ میں فرقہ وارانہ سیاست کے بیج نے جو اس نے بویا تھا بہت جلد جڑ پکڑلی۔ اس فرقہ پروری کا مقصد مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر ان کو ہندوؤں کے خلاف صف آرا کرنا نہیں تھا بلکہ ان کے لئے مخصوص سیاسی حقوق حاصل کرنے کی غرض سے ان کی الگ تنظیم قائم کرنا تھا۔۔۔" (ہندوستانی مسلمان ص۲۰)

"محمڈن ایسوسی ایشن سرسید کے بڑھاپے کی اولاد تھی جس نے اگلے ۱۹۰۰ء میں مسٹر بیک کے انتقال کے ساتھ دم توڑ دیا مگر فرقہ پروری کا وہ بیج بو گئی جو چھ سال بعد مسلم لیگ کی شکل میں پھوٹنے والا تھا۔[۲]"

سرسید کے سیاسی خلفاء

چنانچہ سرسید کے سیاسی خلفاء، مثلاً نواب وقار الملک اور محسن الملک وغیرہ نے دیگر سربرآوردہ، تعلیم یافتہ اور دولتمند مسلم زعماء جس میں مولانا

---

[۱] اسلام اور عصر جدید نومبر ۱۹۶۹ء صفحہ ۶۸-۶۹
[۲] ہندوستانی مسلمان ص ۶۱

محمد علی جوہر، سر آغا خاں وغیرہ پیش پیش تھے، سے مل کر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد ایک طرف انڈین نیشنل کانگریس کے متحدہ قومیت کے نظریہ کا توڑ تلاش کرنا تھا اور دوسری طرف ایجابی طور سے مسلمانوں کے لئے حکومت سے معاشی و تعلیمی مراعات حاصل کرنا تھا۔

فکری اور علمی میدان میں سرسید نے جو کچھ لکھا اس کا مقصد تو "مذہب اسلام کو عیسائی مشنریوں کے حملے سے بچانا اور یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ سچا مذہب ہے اور اصولِ عقل و قوانینِ فطرت کے عین مطابق ہے[۱]" اور دوسرا مقصد اسلام کی تعلیمات کی نئی تعبیر پیش کرنا اور جدید علم طبیعی اور مذہب اسلام میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا تاکہ تعلیم یافتہ مسلمان اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے معقول پسند اور روشن خیال ہوں اور نئے تقاضوں کا ساتھ دیں[۲]" اس کے لئے سرسید نے متعدد کتابیں اور رسالے لکھے اور قرآن شریف کی تفسیر بھی لکھنی شروع کی۔ مگر قرآن کی تفسیر کے مطالعہ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر ان کا انداز وہی ہے جسے ہم نے روحانی اعتذار کہا ہے جو نہ راسخ العقیدہ لوگوں کو مطمئن کر سکتا تھا اور نہ تجدد پسندوں کو[۳]۔"

"سرسید کی اسلام کی تعبیر کی کوشش کو دوستوں اور دشمنوں دونوں کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا[۴]۔" چنانچہ ان کے انتقال کے بعد ان کے غیر سیاسی رفقاء میں مولوی چراغ علی کو چھوڑ کر جنھوں نے تجدد پسندی میں سرسید سے بھی زیادہ غلو کیا اور نتیجۃً "راسخ العقیدہ مسلمانوں کے لئے ناقابلِ التفات بن گئے، سبھی نے سرسید کے قدامت پسندی مخالف اور ترقی پسندانہ اور روشن خیالانہ رجحانات سے مستفید ہونے کے باوجود عقائدی دائروں میں عمومی خیالات سے قربت برقرار رکھی۔

سرسید کے غیر سیاسی رفقاء

نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور مولانا شبلی کی جامع اور ہمہ گیر شخصیتوں نے جہاں ایک طرف

---

[۱]، [۲]، [۳] اسلام اور عصر جدید نومبر ۱۹۶۱ء ص ۷۱، ۶۹، ۶۹

[۴] سرسید کے مذہبی افکار، مصنفہ بشیر احمد ڈار

دار العلوم عثمانیہ، ندوۃ العلماء اور دار المصنفین جیسے ترقی پسند اداروں کی بنیاد ڈالی وہیں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، پروفیسر یوسف حسین اور مولوی عبدالماجد دریابادی جیسی شخصیتیں بھی پیدا کیں جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں علمی و تحقیقی اسپرٹ کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف تحریک دیوبند نے بھی عوامی سطح پر مذہبی تعلیم کا ذمہ اپنے سر لیا اور مختلف شہروں و قصبوں میں چھوٹے بڑے مدارس قائم کئے۔ عوامی مذہبی تعلیم سے قطع نظر اس تحریک نے اپنے گرد ایسے علمی و روحانی لوگ بھی جمع کئے جنھوں نے بعد میں ملک کی جدوجہد آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا اور اولوالعزمی و حریت پسندی کی یادگار قائم کی۔ اس مرحلہ میں حالات کی اٹھان کچھ اس طرح ہوئی اور ایسے اتفاقی عوامل بھی پیش آئے جن کی وجہ سے مذکورہ بالا دونوں تحریکیں جو ایک دوسرے سے متوازی سفر کر رہی تھیں، اپنی وہ کیفیت برقرار نہ رکھ سکیں اور تیزی سے قریب آنا شروع ہو گئیں۔ سرسید اسکول کی اساسیت پسندی اور وابستگان دیوبند کی محدود وسیع النظری نے دونوں گروہوں کو بہت جلد ملا کر مطلوب مقاصد کے لئے مشترکہ جدوجہد کی راہ ہموار کر دی۔

مسلم اجتماعیت کے اس تعلیمی پہلو سے ہٹ کر سیاسی دائروں میں مسلم لیگ نے کئی مدوجزر دیکھے۔ کانگریس کے ساتھ اس نے انتخابی سمجھوتہ بھی کیا اور اس کی بدترین مخالف بھی رہی۔

مسلم سیاسیات

دیوبند سے اس کو مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا اشرف علی تھانوی کی صورت میں حامی بھی ملے اور مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ جیسے مخالف بھی۔ ایک وقت میں یہ محض جاگیرداروں، صاحب ثروت اور طبقہ اشراف سے تعلق رکھنے والوں کا مجمع رہی جس کا کام وقتاً فوقتاً جمع ہو کر رزلیوشن پاس کرنے سے زیادہ نہیں تھا اور دوسرے وقت میں یہ لیاقت علی خاں اور محمد علی جناح وغیرہ جیسے عوامی لیڈروں کے زیر قیادت رہی جن کی معمولی تقریروں میں عوام غیر معمولی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ دوسری طرف خلافت تحریک نے اپنے اثرات میں اضافہ کرنے نیز اسے مزید یقینی بنانے کے لئے علماء کو سیاسی سرگرمیوں کی طرف متوجہ کیا جس کے نتیجہ میں جمعیۃ العلماء قائم ہوئی۔ مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء دونوں پارٹیاں پہلو بہ پہلو سفر کرتی ہوئی اپنے اثرات ترتیب دیتی رہیں۔ ابتدا میں ان کے

درمیان تعلق کی نوعیت خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن بعد کے زمانے میں یہ ایک دوسرے کی بدترین حریف اور رقیب بن گئیں۔ جمعیۃ العلماء کی زاہدانہ اور متقیانہ نفسیات پر زعمائے مسلم لیگ کے غیر مذہبی کردار اور طرز معاشرت کے ردعملی اثرات مرتب ہوئے اور وہ آہستہ آہستہ کانگریس سے قریب آتی گئی۔ اس کے اس طرز عمل میں گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی قائدین کے گہرے سیاسی و شخصیتی تاثرات بھی عامل بنے۔ آئندہ سالوں میں حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ یہ جماعت مسلم عوام سے سیاسی طور پر دور ہوتی گئی اگرچہ مذہبی قرب آخر تک برقرار رہا اور عوام اس کے زعماء سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتے رہے۔

غیر رسمی عوامل

ان تمام اشخاص، اداروں، تحریکوں اور تنظیموں کے ساتھ عمومی مسلم زندگی میں اثر انداز ہونے اور مجموعی ذہنیت کی تشکیل کرنے میں کچھ دوسری شخصیتیں و غیر رسمی عوامل و رجحانات بھی فیصلہ کن رہے ہیں۔ ان میں خصوصیت سے اکبر الہ آبادی اور حالی کی شاعری کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد، مولوی عبدالحلیم شرر وغیرہ کے تاریخی اصلاحی و معاشرتی ناول بھی قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے ایک طرف مسلمانوں کو ان کا ماضی جو غیر قوموں پر ان کی عسکری و ثقافتی فتوحات پر مشتمل تھا، یاد دلایا اور دوسری طرف مسلم سماج کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھ کر معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ کیا۔ اس ضمن میں بین الاقوامی دائروں میں ہو رہے واقعات (جن کا تعلق براہ راست مسلمانوں سے تھا) نے بھی اپنا رول ادا کیا۔ (باقی)

گذارش

خریداری برہان ماندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلہ میں خط و کتابت کرتے وقت یا منی آڈر کوپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔

(منیجر)